Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:2، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

محمد حمید شاہد کے افسانوی مجموعہ "سانس لینے میں درد ہوتا ہے" کا سانحاتی تناظر میں تجزیہ

A Tragic Analysis of Muhammad Hameed Shahid's Short Story Collection "Saans Lene Mein Dard Hota Hai"

Madeeha Yousaf
PhD Scholar Department of Urdu ,
University of Education, Lahore

مدیحہ یوسف
پی ایچ۔ڈی اسکالر شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

The presented text offers a comprehensive critical analysis of Muhammad Hameed Shahid's short stories from his acclaimed collection "Saas Lene Mein Dard Hota Hai", published in 2019. Central to the discussion is the story "Quetta Mein Kuchlak", which reflects the post-9/11 socio-political landscape of Pakistan, particularly the deteriorating security and ethnic tensions in Balochistan. Through an introspective and unnamed narrator, Shahid masterfully captures the pervasive fear, identity crisis, and human vulnerability in a region transformed by terrorism, state surveillance, and linguistic division. The metaphor of "Guwanko" symbolizes the internalization of fear and the alienation from one's own identity. In addition, the analysis extends to other stories in the collection—"Baqi Umar Izafi Hai", "Khooni Lamha Waqt-e-Laam Bachon Ka", "Aik Musalsal Zargasht", "Saas Lene Mein Dard Hota Hai", and "Jang Mein Mohabbat Ki Tasveer Nahin Banti"—each unraveling various dimensions of individual and collective trauma. These narratives explore themes such as psychological disintegration, maternal agony, corruption, war-induced displacement, and the tragic loss of children in terrorist attacks. Whether addressing existential despair, institutional failure, or the collapse of human connection, Shahid's stories weave a layered and symbolic tapestry of postmodern Pakistani life. Overall, this critique reveals how Muhammad Hameed Shahid uses fiction as a means to document national tragedies and intimate suffering, crafting stories that stand at the intersection of memory, politics, identity, and humanity. His fiction resonates as both a personal lament and a socio-political commentary, offering a profound meditation on what it means to live, suffer, and survive in a fractured, fear-ridden world.

Keywords: *Tragedies, Post-9/11 Impacts, Crisis of Identity, State Oppression, Fear and Insecurity, Terrorism, Internal and External Politics, Collective and Individual Tragedies, Memory and Nostalgia, Psychological Conflict, Philosophy of Life and Death, War and Migration, Killing of Innocent Children, Aesthetics and Reality, Existential Crisis, Social Inequality*

کلیدی الفاظ: سانحات ، نائن الیون کے بعد کے اثرات، شناخت کا بحران، ریاستی جبر، خوف اور عدم تحفظ، دہشت گرد، داخلی و خارجی سیاست، اجتماعی و انفرادی سانحات، یادداشت اور نوسٹیلجیا، نفسیاتی کش مکش، موت اور زندگی کا فلسفہ، جنگ اور ہجرت، معصوم بچوں کا قتل، جمالیات اور حقیقت، وجودی بحران، سماجی ناہمواری

OPEN ACCESS
HEC
DRJI
ISSN INTERNATIONAL STANDARD SERIAL NUMBER INTERNATIONAL CENTRE
اشاریہ اردو جرائد
EuroPub

پاکستان کے نام ور ادیب محمد حمید شاہد اردو زبان و ادب میں ایک افسانہ نگار، ناول نگار اور معتبر نقاد کا درجہ رکھتے ہیں ان کی پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو پنڈی گھیب، ضلع اٹک کے نواحی گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد غلام محمد سماجی و سیاسی پہچان کے حامل تھے۔ گھر میں ایک کتب خانہ بنا رکھا تھا جو محمد حمید شاہد کو ادبی پہچان دینے میں کارآمد ثابت ہوا۔ ابتدائی تعلیم پنڈی گھیب سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد زرعی یونی ورسٹی فیصل آباد اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایک بینک کار کی حیثیت سے کیا۔

ادبی خدمات کی ابتدا یونی ورسٹی کے زمانے سے ہی آغاز پا چکی تھیں۔ یونی ورسٹی کے مجلے "کشت نو" کے مدیر بھی رہے۔ محمد شاہد کی پہلی کتاب بھی زمانہ طالب علمی میں ہی لاہور سے شائع ہوئی۔ آغاز میں چند انشائیے لکھے اور پھر افسانہ نگاری کی جانب مستقل ہجرت اختیار کی۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "بند آنکھوں سے پرے، جنم جہنم، مرگ زار، پارو، سانس لینے میں درد ہوتا ہے اور گندم کی مہک" شائع ہو چکے ہیں۔(۱) معروف ناول "مٹی آدم کھاتی ہے اور جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تنقیدی سرمائے میں "اشفاق احمد: شخصیت و فن، ادبی تنازعات، اردو افسانہ صورت و معنی، کہانی اور یوسا سے مکالمہ، اردو فکشن نئے مباحث اور منٹو آج بھی زندہ ہے" شامل ہیں۔ علاوہ ازیں "خوشبو کی دیوار کے پیچھے (خود نوشت)، لمحوں کا لمس، سمندر اور سمندر، انتخاب غزلیات میر" بھی مرتب کیا۔ زیر لب مجموعہ "سانس لینے میں درد ہوتا ہے" ایک افسانوی دستاویز ہے جو کہ ۲۰۱۹ء میں بک کارنر، جہلم سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں افسانوں کو دو حصوں (زندگی سے ڈرتے ہو اور ادمی سے ڈرتے ہو) میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے حصے میں چھ افسانے "کوئٹہ میں کچلاک، باقی عمر اضافی ہے، سانس لینے میں درد ہوتا ہے، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، ایک مکمل زر گزشت اور جیون اک گورکھ دندا" شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں طویل افسانہ "محبت میں جنگ کی تصویر نہیں بنتی" موجود ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانوں میں زندگی کے تجربات، پیشہ ورانہ سہولیات کا فقدان اور عصری آگہی کے بے شمار رجحانات و میلانات قارئین ادب کی نگاہوں کا مرکز بنتے ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم نے محمد حمید شاہد کے افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کے دیباچے میں ان کی کہانیاں کے حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "ان کی کہانیوں میں عہد موجود کی معاشرتی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے نقوش واضح اور اتنے نمایاں ہیں کہ ان سے لمحہ رواں کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔"(۲)

کوئٹہ میں کچلاک محمد حمید شاہد کا بہترین افسانہ ہے، جو کہ ان کی کتاب "سانس لینے میں درد ہوتا ہے" کا پہلا افسانہ ہے۔ محمد حمید شاہد اس قدر حساس اور زمانہ شناس ادیب ہیں کہ عمیق موضوعات ان کے مشاہدے کا واضح حصہ ہیں۔ انھوں نے ایک باشعور اور پڑھے لکھے کردار کا روپ دھارتے ہوئے اس کہانی کا بیانیہ تخلیق کیا ہے۔ یہ ایک بے نام کردار ہے، جو خود سے منسلک تمام جزیات کو بڑی باریک بینی سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہانی کا آغاز کرتے ہی صورت حال کی سنگینی اس طرح بیان کرتا ہے کہ کوئٹہ کے حالات اس قدر کشیدہ تھے کہ بچپن کے دوستوں سے ملنے میں بھی سوچنا پڑتا جب کہ اس سے قبل وہ کوئٹہ آتا تو سب سے پہلے اپنے انھی دوستوں کے ہاں جاتا تھا جن سے اب اجتناب برتا جا رہا ہے۔ جب مرکزی کردار کا ایک ملازم حیات اللہ اسے بچپن کے دوست بشارت سے ملنے سے منع کر دیتا ہے تو وہ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتا ہے۔ افسانے میں نوسٹیلجیائی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ جب وہ اپنے بچپن کے دوست ملک بشارت سے دوستی کے دن یاد کرتا ہے اور ماحول کی بے فکری کو بیان کرتا ہے۔ اس کی وہ یادیں اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ کچھ عرصہ قبل زندگی دہشت سے مبرا تھی اور اب کسی سے بھی ملاقات کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

وہ ماحول کی کشیدگی کو یوں بیان کرتا ہے:

"اس بار میں کوئٹہ پہنچا تو جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ یوں نہیں ہے کہ مجھے وہاں پہنچ کر ہی حالات کے نازک ہونے کی خبر ملی تھی، میں سب کچھ جانتا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں خوف کا ہڈیوں کے گودے میں اُترنا، تو اس کا تجربہ اب ہو رہا تھا۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ ملک بشارت مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے ہوٹل آیا ہوا تھا مگر کلیم خان نے صاف صاف کہہ دیا: دیکھئے صاحب! مناسب ہو گا کہ آپ کسی کے ساتھ نہ جائیں، چاہے وہ آپ کا عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں جانا ہو گا ہم دیکھ بھال کر وہاں لے چلیں گے۔ پلیز یہاں رہیے، یہاں سیکورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"(۳)

محمد حمید شاہد کا افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک "9/11 کے بعد کے عالمی و مقامی تناظر میں ایک سیاسی، سماجی اور انسانی سانحے کی صورت گری کرتا ہے۔ یہ محض ایک ذاتی تجربے کی روداد نہیں بلکہ بلوچستان، بالخصوص کوئٹہ کے بدلتے ہوئے حالات، شناخت کے بحران، خوف، عدم تحفظ اور ریاستی و غیر ریاستی جبر کی تفہیم ہے۔ 9/11 کے بعد پاکستان، خصوصاً بلوچستان میں "شناخت" ایک سنگین مسئلہ بن گئی۔ اس افسانے میں "پنجابی" شناخت ایک خطرے، اجنبیت اور نشانہ بننے کی علامت ہے۔ جب خروٹ آباد میں پنجابیوں کو قتل کیے جانے کی خبر آتی ہے تو راوی کی ہڈیوں تک اتر جانے والی دہشت گویا پورے صوبے میں عدم تحفظ کی گونج بن جاتی ہے۔ خوف کا ہڈیوں کے گودے میں اُترنا، یہ فقرہ افسانے کے سانحاتی مزاج کا مرکز ہے۔ افسانے کا ایک بڑا سانحہ یہ ہے کہ امن کے نام پر، ریاستی سیکورٹی عوامی آزادی کو قید کر دیتی ہے۔ سرینہ ہوٹل قلعہ بن جاتا ہے۔ سڑکیں چیک پوسٹوں سے بھری ہیں۔ "انہوں نے جینا حرام کیا ہوا ہے۔" یہ مکالمہ ریاستی اقدامات پر عوامی ردعمل ہے، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں خود اپنے عوام کو مشکوک بناتی ہے۔

ملک بشارت کا کردار 9/11 کے بعد کی ترقیاتی سیاست اور معاشی خوشحالی کے خواب کی نمائندگی کرتا ہے، جو گوادر میں سرمایہ کاری اور کوئٹہ میں کاروباری امکانات کی صورت نظر آتا ہے۔ لیکن جب سیکورٹی، خوف اور لسانی تعصب معاشرے پر حاوی ہو جائے تو ایسے خواب ریگزار میں سراب ثابت ہوتے ہیں۔ افسانے میں خوف صرف جان کا نہیں بلکہ رشتوں، یادوں، خوابوں، تعلقات اور ماضی کی سچائیوں کا ہے۔ بشارت اور راوی کی برہنگی کی یاد ایک تشبیہ ہے کہ ہم سب کے جسم ننگے ہیں، صرف ہمارے تعلقات ہمیں ڈھانپتے ہیں — اور جب وہ تعلق کھو جائیں، تو صرف ننگی شناخت باقی رہ جاتی ہے۔ اس افسانے میں وہ نائن الیون کے بعد کے حالات کا ذکر کرتا ہے۔ اس سانحے کے بعد امریکہ نے عراق اور پھر افغانستان پر چڑھائی کر دی تھی۔ پاکستان کے بہت سے علاقے بھی اس سانحے کے بعد دہشت کی لپیٹ میں تھے، امریکیوں نے ڈونرز کے ایسے انبار باندھ رکھے تھے کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا، وہ ان حالات کی عکاسی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"پہلے وہاں سیکورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کرتا تھا مگر جب سے امریکہ میں نائن الیون والا حادثہ ہوا اور ٹوئن ٹاور سے دو جہاز ٹکرائے اور بدلے میں امریکہ نے عراق اور بعد ازاں افغانستان پر چڑھائی کی تھی، ادھر پاکستان کے ہر شہر میں سیکورٹی کا سامان بیچنے والوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ خیر، کہیں کہیں تو واقعی ایسے اقدامات کی ضرورت تھی کہ دہشت گردوں کی کارروائی سے بچا جا سکے۔ بہ طور خاص امریکی ڈرونز کے ختم ہونے والے سلسلے نے دہشت کی ایسی فضا کو جنم دیا تھا کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکا تھا۔"(۴)

وہ مقامی لوگوں کی بات سننے کے لیے ایک جلسہ رکھتا ہے، ابھی مقامی رعایا نے اپنے حالات و واقعات سے بیان کرنے تھے کہ اچانک ایک آدمی دوڑتا ہوا اطلال رند کے پاس آیا اور بتایا کہ کچلاک کے حالات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ ان سب افراد کو بہ حفاظت ان کی رہائش گاہ تک پہنچایا جائے۔

جب ارد گرد کے حالات ناساز ہو جاتے ہیں تو مقامی عوام بہت متاثر ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے ہاسٹل کی جانب جارہا تھا اس منظر کو مصنف نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

"کچلاک سے کچھ پہلے ہی ہمیں گڑبڑ کے آثار نظر آنے لگے۔ جہاں سے یارو اور چمن کی طرف سڑک نکلتی تھی، ہم اُس مقام کو دور سے دیکھ سکتے تھے؛ وہاں بپھرے ہوئے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم نے اُلٹے رُخ پر کھیتوں میں گاڑی ڈال دی۔ ڈرائیور نے دور کچے گھروں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "ہم وہاں سے پرے نکلتے راستے پر پہنچ گئے تو سمجھیے ہم اس سڑک پر آگے کو نکل جائیں گے۔۔ محفوظ "اُس نے لفظ محفوظ جملہ مکمل کرنے اور اپنے تھوک کو نگلنے کے بعد کہا تھا اور جیسے ہی اُس نے یہ لفظ ادا کیا تھا ہمارے اندر سے خوف ابل ابل کر ہمارے چہروں پر برسنے لگا تھا۔ ڈرائیور نے بوکھلا کر کلیم خان کی جانب دیکھا جو اپنے سیل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اب وہ بھی پریشان نظر آتا تھا۔ اُس نے ڈرائیور کو سڑک سے کچھ اور دور ہو کر آگے بڑھنے کا کہا۔"(۵)

اکبر بگٹی کے جنازے اور موت کے منظر کو بھی اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ پاکستانی سیاست میں اپنی الگ پہچان رکھنے والا شخص کسم پرسی کی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سانحہ اس کے خاندان کے افراد سے زیادہ اجتماعی سانحہ ہے۔ انسان کے لیے زندگی ایک نعمت ہے، وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس جگہ، علاقے اور ملک سے اس کی محبت لازوال ہوتی ہے لیکن وہیں اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جائے تو نا قابل فراموش المیہ بن جاتا ہے۔

وہ اس تہتر والے بگٹی کے دوہزار چھ میں مارے جانے کا واقعہ سناتے ہوئے بار بار اپنی مٹھیاں بھینچتا اور دانتوں تلے دبے نچلے ہونٹ کو زور سے کاٹتا رہا، اتنی زور سے کہ جہاں اُس کے سامنے والے دانت ہونٹوں میں گڑھے ہوئے تھے وہاں خون کے دو ننھے منے بلبلے اُگ آئے تھے۔ پھر اس نے جیسے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی آنکھیں سامنے مانیٹر کو دیکھ رہی تھیں، یوں، جیسے کچھ نہ دیکھ رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے وہ اپنے آپ سے جنگ کر رہا تھا۔ یہ کیفیت کچھ لمحوں کے لیے ہی رہی ہو گی کہ اُس کا بدن جھر جھرایا اور اس نے ایک بلوچی کہاوت بھی سنائی:

"کتوں کا گلہ کسی نے نہیں دیکھا بھیڑ بکریوں کے گلے ہم روز دیکھتے ہیں حالاں کہ دن میں کتنوں کے گلے کٹتے ہیں۔"(۶)

اپنے دورے کے اختتام پہ وہ رپورٹ جمع کرواتا تھا لیکن اس بار خون کی ہولناکی دیکھ کر وہ خوف وہراس ہی میں مبتلا تھا اور کسی سے بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ انسان جب کسی سانحے کو قریب سے دیکھتا ہے تو وہ سانحہ اجتماعی سانحے سے نکل کر انفرادی سانحے کا روپ دھار لیتا ہے۔ کاش وہ سارے جنازے کا عینی شاہد نہ ہوتا تو وہ اس قدر مضطرب اور پریشان نہ ہوتا۔

افسانے میں بار بار ذکر آنے والا "گوانکو" دراصل خوف، غیر یقینی، اور اپنی ہی شناخت کے اجنبی بن جانے کا استعارہ ہے۔ وہ اپنا سا لگتا ہے، تحفہ دینے آتا ہے، نام لے کر بلاتا ہے مگر درحقیقت وہ دھوکا، گم شدگی اور تباہی کی خبر ہوتا ہے۔ "یہ گوانکو دن کو بھی راہ روک لیتا ہے۔۔۔ ہم میں سے کوئی بن کر یا ہمارا اپنا بن کر۔" یہ اس بات کا گہرا علامتی بیان ہے کہ اب دشمن اجنبی نہیں رہا، وہ اپنا لباس پہن چکا ہے۔ پشین کی ہوائیں جو سیب، آڑو اور بادام کے درختوں کو جگاتی ہیں، ایک لمحاتی سحر ہیں، جیسے ایک دھندلا ہوا خواب۔ وہ لمحہ افسانے میں جمالیاتی سکون کا مقام ہے مگر اسے جلد ہی ریاستی جبر اور جغرافیائی خوف نگل لیتے ہیں۔ یہ افسانہ واضح کرتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر بننے والی پالیسیوں، شناخت کی سیاست، لسانی و جغرافیائی تعصبات، اور ریاستی جبر نے بلوچستان کو ایک ایسے اجتماعی قبرستان میں بدل دیا ہے جہاں لوگ مارے جارہے ہیں، لوگ گم ہو رہے ہیں اور باقی خوف میں زندہ لاشیں بن چکے ہیں۔

"کوئٹہ میں کچلاک" ایک شدید سیاسی اور انسانی سانحے کی تہہ در تہہ کہانی ہے۔ یہ افسانہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب "خوف"، "سکیورٹی"، اور "شناخت" کے درمیان توازن بگڑ جائے تو انسان کا ہونا ہی جرم بن جاتا ہے۔ افسانہ حقیقت اور فینٹسی، سیاست اور جمالیات، ذاتی اور اجتماعی کی دھند میں لپٹا ایک نوحہ ہے۔

محمد شاہد کی متذکرہ بالا کتاب میں ایک افسانہ "باقی عمر اضافی ہے" انفرادی اور اجتماعی سانحے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں جو کردار ہے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہے اور خودکشی کے خواب بنتا ہے۔ زندگی خوشی اور غم سے مزین ہے۔ بعض اوقات انسان غموں سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ خودکشی کرنے اور چھت سے تربوز پھینکنے والے واقعہ کو آپس میں گڈمڈ کر دیتا ہے اور تصور کر لیتا ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے دکھوں، کرب اور درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے کھڑکی سے چھلانگ لگائے گا تو اس کا دماغ بھی تربوز کی طرح فرش پر بکھر جائے گا، جو ناظرین کے لیے باعث عبرت ہو گا۔ اس کی ذات کا غم اور تکلیف دوسروں کے ساتھ آنے والے واقعات کے لیے ڈھارس بن جائے گا۔ گویا یہ سانحہ جو انفرادی تھا، اجتماعی روپ دھار لے گا:

> "اچانک حواس پر چڑھ دوڑنے والے خوف اور تجسس میں گندھی ہوئی حیرت کی آوازیں باہر کوریڈور سے اندر رس رس کر آنے لگی تھیں۔ میں متعجب ہوا؛ ہائیں، تو کیا باہر کی آوازیں بھی اندر آتی رہی تھیں، شاید ہمیشہ سے۔ میں ناحق متعجب ہو رہا تھا؛ یقیناً آوازیں آتی رہی ہوں گی اندر، بس میں ہی دھیان نہ دیتا رہا تھا۔(۷)

یہ افسانہ "باقی عمر اضافی ہے" معروف افسانہ نگار محمد حمید شاہد کا ایک فلسفیانہ، نفسیاتی اور علامتی انداز میں لکھا ہوا شاہکار ہے، جو انسانی وجود، زندگی و موت، ہوش و بے ہوشی، اندر و باہر، یاد و نسیان، حقیقت و وہم، اور مادیت و ماورائیت کے پیچیدہ سوالات کو نہایت باریک بینی سے برتتا ہے۔ افسانہ ایک ایسے کمرے میں بیٹھے راوی کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے جو بارہویں منزل پر واقع ایک دفتر میں موجود ہے۔ اچانک ایک شور مچتا ہے کہ کسی نے بارہویں منزل سے چھلانگ لگا دی ہے۔ سب حیران ہیں، سوال ہو رہے ہیں: کس نے چھلانگ لگائی؟ کون تھا وہ؟ کمرہ نمبر 1202 والا؟ راوی مشاہدہ کرتا ہے کہ باہر کی آوازیں اندر آ رہی ہیں، اور جو شخص کودا ہے، شاید وہ بھی وہی ہے جو یہ سب دیکھ رہا ہے۔ مگر پہچان دھندلا جاتی ہے۔ ایک عجیب مخمصہ اور گہری نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے: "اندر کون ہے؟ باہر کون ہے؟" دھیرے دھیرے یہ احساس شدت اختیار کرتا ہے کہ وہ شخص جو کودا، وہی شاید راوی ہے۔ راوی خود کو اس منظر میں دونوں اطراف دیکھتا ہے، مشاہدہ کرنے والا بھی، اور خودکشی کرنے والا بھی۔ لیکن آخر میں جب سب کھڑکی سے جھانکتے ہیں تو نیچے لاش غائب ہے۔ حیرت اور خوف اور بڑھ جاتا ہے پھر انکشاف ہوتا ہے کہ کھڑکی تو کھلتی ہی نہیں۔ راوی کے اندر ایک "خالی پن" بھر جاتا ہے، وہ اپنے ماضی میں جھانکتا ہے (تربوز، باپ، راگ، دھن)، اور پھر ایک اور طرح سے پیدا ہوتا ہے، وہ جو زندگی کی ہار اور موت کی تسکین کو محسوس کر کے ایک نئی "اضافی" زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ یہ "اضافی" زندگی فالتو نہیں بلکہ تجربہ یافتہ، شعور سے لبریز، اضافت والی زندگی ہے۔ بنیادی سانحہ ایک شخص کی موت ہے جو بارہویں منزل سے گرا ہے یا تو خود کودا یا کسی نے دھکا دیا۔ لیکن: "لاش غائب ہے۔" "کھڑکی بند ہے۔" "نام یاد نہیں۔" "دیکھنے والا وہی ہے جو مرنے والا ہے۔" یہ سب سوال واقعہ کی حقیقت پر شبہ پیدا کرتے ہیں۔ نتیجتاً یہ سانحہ صرف موت کا واقعہ نہیں رہتا بلکہ شناخت کے فقدان اور وجود کے انتشار کا ایک نفسیاتی سانحہ بن جاتا ہے۔

کمرے میں موجود سب افراد بے یقینی اور خوف میں مبتلا ہیں۔ ہر آواز، ہر چیخ، ہر سوال، ذہنی انتشار اور اندرونی سراسیمگی کو ظاہر کرتا ہے۔ راوی آخر کار اپنے خالی پن کو محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے: "ہاں، خالی پن بھی جگہ گھیر سکتا ہے۔" افسانے میں اندر اور باہر کی بار بار تکرار دراصل وجود کی

جہتوں کو کھولتی ہے۔ زندگی اور موت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شخصیت اپنی مرکزیت کھو بیٹھتی ہے، اور راوی ایک "اضافتی وجود" میں ڈھل جاتا ہے: "یہ زندگی ہے، یہی موت۔"

کھڑکی ایک علامت ہے: ایک ایسا راستہ جو واہمہ ہے، حقیقت نہیں۔ شیشہ کھلتا نہیں — مگر کودنے کی خبر ہے — یہ حقیقت اور تصور کی لکیر کو مٹا دیتا ہے۔ تربوز اور گودے کا بکھرنا — انسانی جسم کی فانی حقیقت کو ظریفانہ اور علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ راگ، دھن، الاپ، استھائی، انترا — زندگی اور موت کے میوزیکل استعارے ہیں۔

"باقی عمر اضافی ہے" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں سانحہ صرف ایک موت نہیں بلکہ شناخت کا انحلال، وجود کی گمشدگی، اور حقیقت کی پرتوں کا کھلنا ہے۔ یہ موت اور زندگی کے درمیان کھنچی لکیر کو مٹا دیتا ہے۔ اور آخر میں انسان — راوی — "فالتو" نہیں، بلکہ "اضافہ شدہ" ہو جاتا ہے، جیسے راگ میں استھائی کے بعد انترا آتا ہے، ایک نئی شناخت، ایک نئی دنیا کے ساتھ۔ "سانس لینے میں دود ہوتا ہے" افسانہ بھی انفرادی سانحے کا عکاس ہے۔ ایک عورت جو دردِ زچہ میں مبتلا ہے وہ اپنی تکلیف کسی سے بانٹ نہیں سکتی۔ تکلیف برداشت کرتی ہے اور اگلی نسل کو اپنے خون اور پسینے سے سینچ کر اس دنیا میں لانے کا کشٹ اٹھاتی ہے۔ افسانہ "سانس لینے میں درد ہوتا ہے" از محمد حمید شاہد ایک گہرے وجودی، جذباتی اور سانحاتی تجربے کا آئینہ دار ہے، جس میں زندگی، موت، جنم اور فنا کو ایک دوسرے کے متوازی اور باہم مربوط دکھایا گیا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ایک باپ کی موت اور بیوی کی زندگی و موت کے درمیان لڑائی کو بیان کرتا ہے بلکہ انسانی وجود کی نزاکت اور زندگی کے متبادل چہرے کو بھی سامنے لاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار (راوی) دو اہم واقعات کے بیچ الجھا ہوا ہے۔ راوی کو اپنے والد کی موت یاد آتی ہے۔ وہ لمحہ جب اس کا باپ آخری سانسیں لے رہا تھا، اور وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ باپ کی نظریں اسے دیکھ کر تھرتھرا کر بجھ جاتی ہیں۔ یہ لمحہ راوی کے لیے بہت گہرا اور تکلیف دہ ہے۔ وہ سوچتا ہے: "کیا یہی زندگی تھی؟" دوسری طرف، راوی ہسپتال میں ہے جہاں اس کی بیوی لیبر روم میں ہے اور بچے کو جنم دے رہی ہے۔ درد، چیخیں، بدحواسی، ڈاکٹر کی بے بسی، سانس کی بے قراری — سب کچھ ایک سانحے کی فضا پیدا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کہتی ہے کہ: "اب کیس نارمل نہیں رہا، ماں اور بچے دونوں کی جان خطرے میں ہے۔" راوی ایک رضامندی فارم پر دستخط کرتا ہے تاکہ دونوں کی جان بچانے کی کوشش ہو سکے۔

نرس کا تلخ جملہ "خس کم جہاں پاک"، جو کسی کے مر جانے پر کہی گئی ایک بے حس بات ہے، راوی کو چونکا دیتی ہے۔ آخر میں، جب وہ سب کچھ برداشت کر رہا ہوتا ہے، ایک چیخ ابھرتی ہے — نوزائیدہ کی چیخ — جو موت کی فضا میں زندگی کے گیت کی طرح ہے۔ افسانہ "سانس لینے میں درد ہوتا ہے" زندگی اور موت کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتا، بلکہ انہیں ایک تسلسل، ایک دائرہ، ایک لَے کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں ایک کا خاتمہ دوسرے کی ابتدا بن جاتا ہے۔ راوی دو انتہاؤں کے بیچ ہے۔ ایک پُرسکون موت اور ایک چیختی ہوئی زندگی اور وہ دونوں کو برابر شدت سے جیتا ہے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو قاری کے اندر خاموش سناٹا بھی چھوڑتا ہے اور مہین سی چیخ بھی جو زندگی سے بھرپور ہے:

> "ایک وجود کی کوکھ سے ایک اور زندہ وجود کا نکلنا، سہولت سے نہیں، انگ انگ میں چھپے ہر درد کو جگا کر، بلکہ اُسے موت کے مقابل کر کے بھی، جو ایک نئی زندگی کے لیے پوری طرح تیار بدن پر کچھوکے لگا کر اپنے آپ کو محسوس کراتی ہے، کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مشکل مگر زندگی سے بھرپور۔

وہ موت کو پورا زور لگا کر پرے دھکیلتی رہی۔" (۸)

"خونی لام ہوا قتلام بچوں کا" سولہ دسمبر کو آرمی پبلک سکول میں جو دہشت پھیلائی گئی تھی اور ننھے معصوم پھولوں کو بغیر کسی وجہ سے نشانہ بنا کر قتل کیا گیا تھا، یہ افسانہ محمد حمید شاہد نے اس دردناک سانحے کے پس منظر میں تحریر کیا ہے۔ جب ماؤں نے اپنے بچوں کو یہ سوچ کر اسکول بھیجا تھا

کہ وہ ننھے تارے دوپہر کے وقت آنکھوں میں خواب بسائے واپس لوٹ کر آئیں گے اور جو ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالنے کے خواب بنتے گئے ہیں لیکن صد افسوس وہ ننھے تارے، چھوٹے پھول داغ مفارقت دے کر جہان فانی سے کوچ کر گئے:

"جس روز پشاور میں طالبان نے ڈیڑھ سو بچوں کو بے دردی سے مار ڈالا تھا۔ اُنہوں نے فوراً بعد والے جمعے کو بہت درد بھرا خطبہ دیا تھا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ اس خطبے کے بعد آنے والی جمعرات کو ان کا اپنا پوتا توقیر خود کش حملہ آور سمجھتے ہوئے گولیوں سے بھون ڈالا گیا تھا۔ جب ننھے توقیر کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش گھر کے آنگن میں لائی گئی تھی تو وہ بھاگ کر کئی روز پہلے والا وہ اخبار لے آئے تھے جس میں پشاور اسکول کے بچوں کی کٹی پھٹی لاشوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ کبھی اخبار کی طرف انگلی لے جاتے اور کبھی پوتے کی لاش کی جانب، پھر انھوں نے اوپر آسمان کی طرف منھ کیا اور چلاتے ہوئے بولے: ان بچوں کا کیا قصور ہے میرے مولا"(۹)

قومی سانحات سے اہل خانہ اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ دہشت گردی نے پاکستان کو کئی سالوں سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کئی گھروں کے چراغ گُل ہوئے، کئی گھروں کے چولھے ٹھنڈے پڑ گئے، بہت سارے افراد کو جو بچ تو گئے لیکن اپنے جسم کے کسی اہم حصے سے محروم ہو گئے اور وہ معاشرے کے محتاج ہو گئے۔ ایسی بہت سی داستانیں ان سانحات کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئیں۔ توقیر نامی بچہ جو پیدا ہوتے ہی اپنی والدہ کے پیار سے محروم ہو گیا تھا، اس کی ماں دورانِ پیدائش انتقال کر گئی تھی۔ اس کی دادی نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اور جب وہ پندرہ سال کا ہوا تو پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنا جسے افسانہ نگار یوں تحریر کرتا ہے:

"باپ کے جانے تک وہ بھلا چنگا تھا مگر ایک رات وہ اُٹھا تو اُس کی گردن درد سے ٹوٹ رہی تھی۔ اُسے اسپتال لے جایا گیا، کئی ٹسٹ ہوئے اور پتا چلا اسے گردن توڑ بخار تھا، علاج ہوتا رہا مگر وہ گردن سیدھی رکھنے کے قابل نہ ہو سکا، چلتا تو سر سے پیر تک جھٹکے کھاتا، بولتا تو زبان میں تتلاہٹ آجاتی، بات کرتے کرتے بھول جاتا کبھی کبھی ایک بات میں دوسری کو ملا دیتا تو سننے والوں کے قہقہے نکل جاتے تھے مگر اس بار کچھ ایسا ہوا تھا کہ سب کی چیخیں نکل گئی تھی۔"(۱۰)

پشاور میں دہشت گردوں نے اس قدر ناروا سلوک بچوں کے ساتھ کیا کہ یہ بچہ جب گھر سے باہر نکلا اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں پھیلی دہشت سے انجان تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں کہہ رہا تھا میں پھٹ جاؤں گا میں پھٹ جاؤں گا۔ پولیس والوں کے پاس سے لڑکھڑاتا ہوا گزرا تو انھوں نے اسے دہشت گرد تصور کرتے ہوئے مار ڈالا۔ اس منظر کو حمید شاہد نے اس طرح افسانے کا حصہ بنایا ہے:

"توقیر کی نظر اس پر پڑی تو ٹھٹھک کر رکا، پھر یہ سوچ کہ جی ہی جی میں خوش ہوا کہ وردی والے کو ڈرانے میں بہت مزا آئے گا۔ اگلے ہی لمحے وہ اُس کی جانب لپک رہا تھا۔ پولیس والا واقعی خوف زدہ ہو گیا تھا، اس نے بوکھلا کر بندوق سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔"(۱۱)

اجتماعی سانحے کے نتیجے میں انفرادی المیہ وقوع پذیر ہوا، سب ڈرے ہوئے تھے۔ انسان اپنے سائے سے بھی ڈرتے تھے۔ وہ بچہ توشر ار تا کہہ رہا تھا کہ میں پھٹ جاؤں گا ماحول کشیدہ تھا، انسان انسان سے نجانے کونسی دشمنی نبھا رہا ہے۔

"ایک مسلسل زر گزشت "حمید شاہد نے اس افسانے میں ایک عام کسان کی زندگی میں پیش آنے والے سانحے کو موضوع سخن بنایا ہے۔ اس کا گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتا تھا، وہ اپنے حالات بدلنے کے لیے دبئی جانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہ تھے، اُس نے بینک سے قرضہ لینے کا ارادہ باندھا بینک منیجر کو جا کر اس نے اپنی غرض بتائی۔ بینک منیجر نے کہا میں تمھیں فارمیٹی کے طور پر ٹریکٹر لے کر دے دوں گا اور پھر بعد میں، میں خود ہی

اسے بیچ دوں گا مجھے پچاس ہزار روپے رشوت کی مد میں چاہیے۔ گارنٹی کے طور پر اس نے اپنی زمین کے کاغذات بینک کے حوالے کر دیئے کچھ عرصہ بعد جب وہ شخص واپس آیا تو بینک نے اس کی زمین نیلام کر دی تھی اب زمین کا نیا مالک قبضہ لینے کے لیے اس پہ دباوڈال رہا تھا۔ جب اس نے بینک مینجر سے بات کی اس نے سراسر اُس شخص پہ ہے سارا سیا الزام دھر دیا زمین اس علاقے کے ایم این اے نے لی تھی۔ جب اس برانچ کا آرڈٹ آفیسر آیا تو اس پہ یہ عندیہ کھولا کہ اُس ایم این بنے نے قومی خزانے کو لاکھوں روپے کا چونا لگایا ہے۔ اور سونے پہ سہاگہ کہ وہ قرضہ لے کر پچھلے قرضے کی اقساط ادا کرتا ہے اور نیا قرضہ پھر بینک اسے دے دیتا ہے۔ اس طرح وہ ممبر اسمبلی، اس کی بیوی بچے اور اس کے گھر کام کرنے والے افراد سب بینک سے قرضہ لیتے اور واپس کرتے۔ اب تو ان کا لون معاف کر دیا جاتا۔ اور مزید لون ان کو مل رہا تھا۔ آڈٹ آفیسر نے جب اس معاملے کی انکوئری کی تو اس بارے میں حمید شاہد لکھتے ہیں:

> "جب وہ رپورٹ پر دستخط کر رہا تھا تو اسے ٹیلی فون پر گزشتہ روز بھی صاحب سے ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ پہلے تو اُس نے اس کی نئی پوسٹنگ پر اسے مبارک باد دی تھی حالاں کہ یہ اب اتنی نئی بھی نہ رہی تھی پھر بہت نرم آواز میں پوچھا تھا، آپ کی بیٹی ندا، سرسید کالج میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہے نا۔ اسے تعجب ہوا تھا کہ انہیں اس کی بیٹی کا نام معلوم تھا، اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جی کہہ کر تصدیق بھی کر دی تھی مگر بعد میں اس کمینے انداز کی دھمکی پر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ اس کے بعد بھی کبھی صاحب نے بہت کچھ کہا تھا مگر اس کے کانوں میں عجب طرح کا شور تھا کہ وہ ڈھنگ سے کچھ نہ سن پایا تھا۔"(۱۲)

رپورٹ جمع کروانے کے باوجود اس کرپٹ سیاست دان پہ کسی نے ہاتھ نہ ڈالا۔ آڈٹ آفیسر چاہتا تھا کہ اس کسان کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ لیکن صد افسوس! اس کسان کی زندگی برباد ہو گئی اور الٹا اس کرپٹ سیاست دان کو وزارت کا قلم دان سونپا گیا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس سیاست دان کو سزا ہو گی وہ ساری عمر جیل کی کال کوٹھڑی میں بسر کرے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا ہے۔ یہ المیہ معاشرتی سطح سے ابھر کر قومی سطح میں اپنی جڑیں گاڑ چکا ہے اور ایسے ناسور کی شکل اختیار کر گیا ہے جو لوگوں کی زندگیوں ہیں، نہ صرف زہر گھول رہا ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا امیج بھی خراب کر رہا ہے۔

حمید شاہد کے افسانوی مجموعے سانس لینے میں درد ہوتا ہے "میں شامل افسانہ "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" افغانستان پر امریکی فوج کے تسلط اور نائن الیون کے نتیجے میں ہونے والی دہشت گردی کی داستان رقم کرتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پہ ہونے والی دہشت گردی سے خاندانوں کے خاندان متاثر ہوئے۔ افغانستان میں جب امریکی تسلط بڑھا تو بہت سارے افراد نے اپنے ملک سے ہجرت کا سوچا۔ ایک افغانی شہری اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ پاکستان کی طرف اپنا گھر بار چھوڑ کر کوچ کر رہا تھا کہ راستے میں امریکی فائرنگ اور بمباری سے اس کی بیوی کے جسد خاکی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گے اس کے بیٹے نے چادر میں اپنی ماں کے جسد خاکی کے حصے اکھٹے کیے، اور ایک پہاڑ کی اوٹ میں جا کر گڑھا کھودا اور اپنی ماں کو اس میں دفن کیا۔ وہ پہلے اپنا گھر، کاروبار اور ملک چھوڑنے کے غم میں مبتلا تھے اور پھر راستے میں ماں کے ساتھ ہونے والے حادثے سے تاحیات غم میں مبتلا رہے۔ ہجرت کا یہ بیانیہ افسانے میں یوں بیان ہوا:

> "جب سے افغانستان میں جنگ چھڑی ہے اور سارے خطے میں بدامنی کے سلسلے کا آغاز ہوا ہے، وہاں سے مہاجر ہو کر اس شہر میں آباد ہونے والے دیگر شعبوں کی طرح اس کاروبار میں بھی اندر تک بخیل ہو گئے ہیں۔"(۱۳)

"شیریں زمان باپ کو سہارا دے کر ایک طرف بٹھاتا ہے اور کندھے پر جھولتی چادر سے ایک ٹکڑا اپھاڑ کر باپ کی ران سے بہنے والے خون کو روکنے کے لیے اسے کس کر باندھ دیتا ہے۔ اس چادر کو وہ باپ کے سامنے خالی زمین پر بچھا دیتا ہے اور سارے میں بکھرے ماں کے گوشت کے لوتھڑے اُس پر ڈھیر کر کے گرہ لگا کر پوٹلی بنالیتا ہے۔ پوٹلی باپ کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے جسے وہ سینے سے لگالیتا ہے۔ وہ اپنے کام میں یوں جتا ہوا ہے جیسے کوئی روبوٹ ایک ترتیب سے سارے کام کرتا ہے۔ اب وہ اپنے باپ کو کندھے پر ڈال کر چلنے کے لیے تیار ہے، بارود اب بھی برس رہا ہے مگر وہ پہاڑی علاقے میں پہنچ جاتے ہیں۔"(۱۴)

امریکی قبضے سے پہلے روس نے افغانی شہریوں کو کئی سالوں تک یرغمال بنائے رکھا۔ اُن افراد کے ساتھ جو حادثات پیش آئے ان کو اگر رقم کیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس قدر سانحات افغانی شہریوں نے برداشت کیے کہ جہاں گئے داستان چھوڑ گئے۔ بھوک اور مفلسی سے بہت سے افراد جو نجھتے رہے۔ جب روسی فوجیں آئیں وہاں کا آب پاشی کا نظام تباہ ہونے سے باغ اجڑ گئے تو اس کے خاندان پر بھوک چڑھ دوڑی، جو کچھ جمع پونجھی تھی ختم ہو گئی۔"(۱۵)

نائن الیون کے حادثے نے جہاں امریکی باشندوں کی زندگی کو کرب اور دکھ میں مبتلا کیا وہی اسلامی ممالک خصوصا پاکستان، بنگلہ دیش اور افغنستان کو حدف بنایا گیا۔ امریکہ میں جو دہشت گردی ہوئی اس کے بارے میں حمید شاہد رقم طراز ہیں:

> "یہ جنگ بھی عجیب وغریب ہے، ہماری نہیں ہے مگر ہماری اپنی ہو گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ جنگ جو ریمنڈ کے امریکہ نے خوب خوب دھکائی، بہ طور خاص تب جب اسے روسیوں کو وہاں سے نکالنا تھا اور روسیوں کی پسپائی کے بعد فتح کے نشے میں چور ان مجاہدوں کے خلاف جواب دہشت گرد ہو گئے تھے۔"(۱۶)

دہشت گردی معاشرے کے خمیر میں خوف، عدم برداشت اور بے یقینی کی ایسی آمیزش کر دیتی ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے بدظن اور منتشر کر دیتی ہے۔ اجتماعات ٹوٹنے لگتے ہیں، رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں اور یگانگت کی جگہ شکوک وشبہات لے لیتے ہیں۔ یوں ایک زندہ دل معاشرہ، رفتہ رفتہ بے روح ہجوم میں ڈھل جاتا ہے۔ جہاں دہشت گردی کا سایہ پڑ جائے، وہاں علم کے چراغ بجھنے لگتے ہیں۔ تعلیمی ادارے ویران ہو جاتے ہیں، والدین بچوں کو اسکول بھیجنے سے خوف کھانے لگتے ہیں اور اساتذہ مستقل خطرے کے سائے میں تدریس کرتے ہیں۔ نتیجتاً ایک پوری نسل تعلیمی پسماندگی، فکری جمود اور ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتی ہے۔ دہشت گردی سرمایہ کاری کو روکتی ہے، روزگار کے مواقع ختم کرتی ہے، اور ملک کی معیشت کو زوال پذیر بنا دیتی ہے۔ بازاروں میں ویرانی چھا جاتی ہے، صنعتیں بند ہو جاتی ہیں اور محنت کش بے روزگار ہو کر بھوک، افلاس اور مجبوری کی چکی میں پسنے لگتے ہیں۔ اس خوف کی معیشت میں خوش حالی صرف خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ دہشت گردی انسان کے ذہن و دل کو اس بری طرح مجروح کرتی ہے کہ وہ معمول کی زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ ایک عام فرد کا ہر دن، ہر لمحہ ایک انجانے خدشے میں گزرتا ہے۔ دل میں ہمیشہ یہ دھڑکا رہتا ہے کہ جانے کب، کہاں، کون سا سانحہ پیش آ جائے۔ اس مستقل تناؤ کا نتیجہ نفسیاتی مسائل، تنہائی، مایوسی اور عدم تحفظ کے احساس کی صورت نکلتا ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانوں میں بھی دہشت اور اس سے منسلکہ متعدد رویوں کو قارئین ادب کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ چودھری، زوار طالب، محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری "بند انکھوں سے پرے اور جنم جہنم" کے حوالے سے، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز: اسلام اباد، ۲۰۰۲ء، ص، ۷-۱۰

۲۔ توصیف تبسم، ڈاکٹر، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے، ص:۱۲
https://www.rekhta.org/ebooks/detail/hameed-shahid-ke-pachas-afsane-mohammad-hameed-shahid-ebooks?lang=ur

۳۔ حمید شاہد، محمد، سانس لینے میں درد ہوتا ہے، بک کارنز: جہلم، ۲۰۱۹ء، ص:۲۰

۴۔ ایضاً، ص:۲۱

۵۔ ایضاً، ص:۲۷

۶۔ ایضاً، ص:۳۳

۷۔ ایضاً، ص:۴۸،۴۸

۸۔ ایضاً، ص:۶۵

۹۔ ایضاً، ص:۸۱

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۹۱

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۱۰،۱۱۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۴۲

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۲۵

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۴۴

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۵

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Chaudhry, Zawar Talib, Muhammad Hameed Shahid ki Afsanah Nigari "Band Ankhon Se Paray aur Janam Jahannam" ke Hawalay Se, National University of Modern Languages: Islamabad, 2002, P: 7–10
2.Tauseef Tabbsam, Dr. Muhammad Hameed Shahid ke Pachaas Afsanay, P: 12
https://www.rekhta.org/ebooks/detail/hameed-shahid-ke-pachas-afsane-mohammad-hameed-shahid-ebooks?lang=ur
3. Hameed Shahid, Muhammad, Saans Lene Mein Dard Hota Hai, Book Corner: Jhelum, 2019, P :20
4. Ibid, P:21
5. Ibid, P:27
6. Ibid, P:33
7. Ibid, P:47–48
8. Ibid, P:65
9. Ibid, P:81
10. Ibid, P:90
11. Ibid, P:91

12. Ibid, P:110–111
13. Ibid, P:142
14. Ibid, P:125
15. Ibid, P:144
16. Ibid, P:135